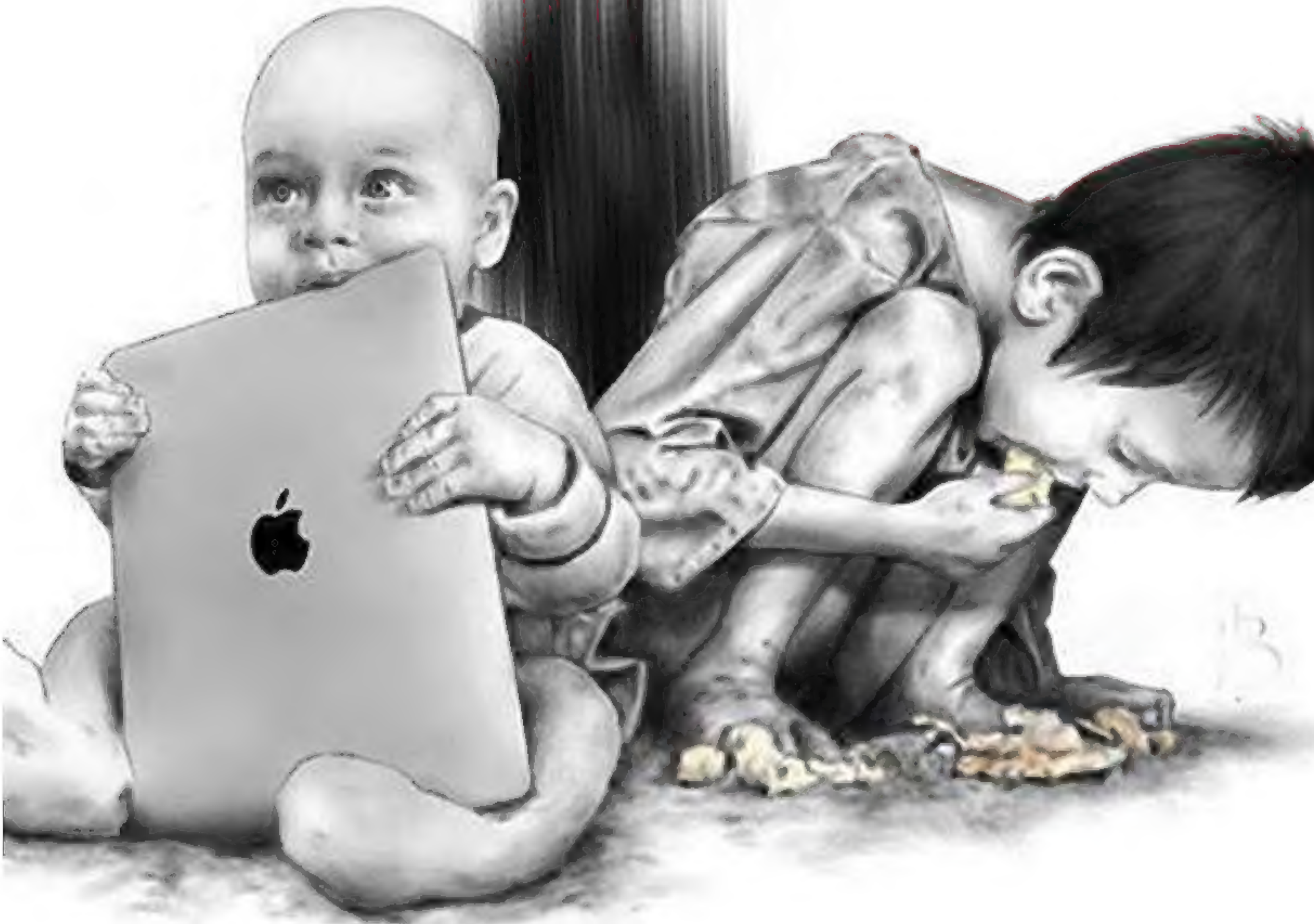
تیسری دنیاکے مسائل
اور
جدید سائنسی ترقی



شہزاد احمد

بسم الله الرحمن الرحيم

اللهم صل علىٰ محمد و آل محمد وعجل فرجهم اجمعين

1

سائنس کوئی ایسا علم نہیں ہے، جس کا تعلق دوسرے علوم کے ساتھ نہ ہو، یہ کوئی بن ماں یا بن باپ کی اولاد نہیں ہے، بلکہ اس کا تو پورا شجرہ نسب موجود ہے اور اسے تھوڑے بہت اختلاف کے ساتھ بار بار دہرایا بھی جاتا ہے، اگر نیچے سے اوپر کی طرف جائیں، یعنی حال سے ماضی کی طرف سفر کریں تو جوں جوں ہم جد امجد کی طرف بڑھتے ہیں نام غیرواضح ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور اگر ان ناموں کو واضح کرنے کی کوشش کی جائے تو کھلتا ہے کہ یہ تو جانے پہچانے نام ہیں۔ اس میں یونانی، چینی، ہندوستانی اور اسلامی ناموں کے علاوہ بھی کچھ نام آتے ہیں مگر خاص طور پر سائنس کے حوالے سے یونانی اور اسلامی ناموں ہی کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

جارج سارٹن (George Sarton) نے سائنس کی یادگار تاریخ پانچ جلدوں میں لکھی ہے، اس کی پہلی اور تیسری جلد کا ترجمہ اردو میں ہو چکا ہے اور اسے امتیاز علی تاج صاحب کے زمانے میں 'مجلس ترقی ادب لاہور' نے شائع کیا تھا، مگر ہمارے ہاں اس کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا گیا، شاید اس کی وجہ سائنس اور اسلامی تحقیقی علوم کے سلسلے میں ہماری عدم دلچسپی ہو، مگر اس وقت میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ سائنس کی تاریخ کو بیان کرنے کے لیے اصول یہ وضع کیا گیا تھا کہ سائنس کو چھوٹے چھوٹے ادوار میں تقسیم کر دیا گیا، ہر عہد نصف صدی پر مشتمل تھا، پھر ہر نصف صدی کے ساتھ کسی ایک سائنسی شخصیت کا تلازمہ بنا دیا گیا۔ جس کا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ متعلقہ شخصیت نے سائنس کو آگے بڑھانے میں کوئی نہ کوئی غیر معمولی خدمت انجام دی تھی۔ چنانچہ یہ تاریخ اپنی موجودہ شکل میں 900 قبل مسیح سے شروع ہوتی ہے اور بارہویں صدی عیسوی تک آتی

ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے' جب سائنس کی ترقی کی زمام اہل مغرب کے ہاتھ میں جانی شروع ہو جاتی ہے اور پھر اس کا تعلق پوری طرح مغرب ہی سے قائم ہو جاتا ہے' 450 سے 400 قبل مسیح کو سارٹن' افلاطون کا عہد قرار دیتا ہے' اس کے بعد آدھی صدی ارسطو کی آتی ہے پھر اقلیدس (Euclid) کی پھر ارشمیدس (Aarchimedes) وغیرہ کی۔ اس کے بعد چینی صدی ہے' ستان سانگ (Hsitan Tsang) اور آئی چنگ (I Ching) کی اور 750 عیسوی سے لے کر 1100 عیسوی تک' ساڑھے تین سو سال ایک مسلسل اور نہ ٹوٹنے والے عہد کی کڑیاں ہیں' یعنی جابر ابن حیان' خوارزمی' رازی' المسعودی' ابوالوفا' البیرونی' ابن سینا' ابن الہیثم اور عمر خیام' یہ سبھی شخصیتیں مسلمان تھیں مگر ان کا تعلق دنیا کے مختلف جغرافیائی خطوں سے تھا یہ عرب' ترک' افغان اور ایرانی تھے یعنی یہ اس وقت کی اسلامی دولت مشترکہ کے افراد تھے۔ ان کے بعد سارٹن کی تاریخ میں پہلی بار کوئی مغربی نام ظاہر ہوتا ہے' گیراڈ آف کریمونا (Gerard of Cremona) پھر راجر بیکن (Roger Bacon) مگر اس کے بعد اڑھائی سو برس تک یہ اعزاز تقسیم ہوتے رہتے ہیں' ان میں ایسے نام آتے ہیں جن میں ابن رشد' نصیر الدین طوسی اور ابن نفیس شامل ہیں' ابن نفیس وہ شخصیت ہیں' جس نے ہاروے (Harvey) کے نظریے سے پہلے خون کی گردش کا ذکر کیا تھا' یہ الگ بات کہ اس کا کریڈٹ اب صرف ہاروے ہی کو دیا جاتا ہے۔

اہل مغرب کے ہاں یہ رجحان موجود ہے کہ وہ ہر چیز کا آغاز مغرب ہی سے کرتے ہیں' یونان کا اس قدر ذکر بھی شاید اسی لیے کیا جاتا ہے کہ وہ بھی مغرب ہی میں شمار ہوتا ہے' حالانکہ عملی طور پر یونان اور خاص طور پر تاریخی یونان میں وہ علاقے بھی شامل تھے جو اب مشرق کے بہت قریب ہیں' اگر اس تقسیم کو شمال اور جنوب کے حوالے سے دیکھا جائے تو یونان کو شمال میں شمار نہیں کیا جاتا' بہت سے مشرقی ممالک کی طرح وہ بھی ایک ترقی پذیر ملک ہے جو ترقی یافتہ ہونے کی کوشش کر رہا ہے اور چند برس پہلے ہی اس نے بعض ایسے اداروں کا رکن بننے کی کوشش کی ہے جو سائنس کی ترقی میں خصوصی کردار ادا کر رہے ہیں۔

اگرچہ یونان کو سائنس کی ابتدائی تاریخ میں بھی ایک خاص اہمیت حاصل ہے' کیونکہ بہت سے ایسے سوال جن کو بعد میں سائنسی علوم میں خصوصی اہمیت حاصل ہوئی'

یونانیوں ہی نے اٹھائے تھے مگر سائنس کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ بھی یونانی ہی بنے تھے' اس کی دو وجوہات تھیں ایک بالواسطہ اور دوسری بلاواسطہ۔ بالواسطہ وجہ یہ تھی کہ قرون وسطٰی کے دوران بہت سے لوگ ایسے تھے جو یونانی خیالات سے سرمو انحراف کرنے کے لیے تیار نہیں تھے' ایسے ہی گروہ کا جھگڑا گلیلیو کے ساتھ ہوا تھا' یہ لوگ بعض مذہبی حلقوں میں بھی بہت زیادہ طاقتور تھے اور ایسے نظریات تشکیل دے چکے تھے' جن میں مسیحی اور یونانی معتقدات کو ایک اکائی بنا دیا گیا تھا۔ گلیلیو کے نظریات کی وجہ سے عسائیت پر چوٹ کم پڑتی تھی مگر اس زمانے کے دانشوروں کے تعصبات زیادہ متاثر ہوتے تھے۔ پیسا کے مینار سے دو مختلف اوزان کے باٹ پھینکنے کی کہانی سے چرچ کسی طرح متاثر نہ ہوتا تھا' اگر یہ بات ثابت ہو جاتی کہ کسی بھی شے کے زمین پر گرنے کی رفتار کا تعلق وزن کے ساتھ نہیں ہوتا' تو اس سے مذہب کو کیا فرق پڑتا تھا؟

دوسری وجہ کہیں زیادہ اہم ہے یونان کی حکمت کی بنیاد ان کا استخراجی (Deductive) طریق کار تھا' یعنی وہ پہلے اولیات یا مسلمات (Axiom یا Universals) تلاش کرتے اور پھر ان کی مدد سے نتائج نکالتے چلے جاتے تھے' ایک ایک چیز کا مطالعہ کر کے اس سے اصول وضع کرنا' مخصوص یونانی رویہ نہیں تھا' اس لیے یونانی علم کی روش استخراجی تھی' وہ استقرائی (Inductive) طریق کار کو گھٹیا درجے کی شے سمجھتے تھے' ان کا یہی رویہ قرون وسطٰی کے دوران بھی رواج پا گیا تھا' خاص طور پر مغرب کے ممالک اس سے ذرا سا انحراف کرنے کو بھی تیار نہیں تھے۔ مگر مسلمانوں نے استقرائی رویہ نہ صرف قبول کیا تھا بلکہ اسے علم کی بنیاد بنانے کی بھی کوشش کی تھی۔ یہی رویہ اب جدید سائنس کی بنیاد ہے' اس بات سے عام طور پر انکار تو نہیں کیا جاتا کہ مسلمانوں نے استقرائی رویے کو علم کی بنیاد بنایا تھا' البتہ رسل (Russell) کی طرح یہ ضرورت کہا جاتا ہے کہ مسلمان سائنس دان جو مواد جمع کرتے تھے اس سے نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت ان میں نہیں تھی یعنی وہ سائنسی اصول وضع نہیں کر سکتے تھے۔

میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا کہ یہ اعتراض درست ہے یا نہیں' البتہ ایک بات عرض کرنا ضروری ہے اور وہ یہ کہ جو کچھ مسلمانوں نے یونان سے حاصل کیا تھا جب وہ یورپ تک پہنچا تو اس کی نوعیت تبدیل ہو چکی تھی۔ اب وہ ایک ایسی حالت میں تھا کہ

اس پر جدید سائنس کی بنیاد رکھی جا سکتی تھی اور بہت حد تک رکھی جا چکی تھی۔

سپنگلر (Spengler) اور ٹائن بی (Toynbee) نے فلسفہ تاریخ میں یہ متعین کرنے کی کوشش کی تھی کہ تاریخی ادوار میں ترقی اور زوال کی نشاندہی کی جا سکتی ہے' مگر یہ نظریہ بنیادی طور پر ابن خلدون نے متعارف کروایا تھا' اس وقت ہم جس دور میں سے گزر رہے ہیں' اس میں مغرب اور خصوصاً امریکا اپنے کمال کی طرف سفر کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ مگر ہر عہد کا گراف ایک خاص مدت تک اوپر اٹھتا رہتا ہے' پھر گرنا شروع ہو جاتا ہے' اسی طرح ترقی کا یہ رجحان اپنے مقامات تبدیل کرتا رہتا ہے' اور بقول آرتھر کوسلر (Arthur Koestler) انسانی تاریخ کے دوران کبھی ایک علاقے کو دوبارہ عروج حاصل نہیں ہوا' عروج و زوال کی یہ کہانی عمودی بھی ہے اور افقی بھی' عمودی ان معنوں میں کہ یہ گراف بتدریج اوپر کی طرف اٹھتا ہے' ترقی کرنے والے ہر علاقے یا قوم کا ایک بچپن ہوتا ہے' جوانی ہوتی اور پھر اس کے بعد اس پر بڑھاپا آ جاتا ہے' مگر مکمل طور پر موت واقع نہیں ہوتی۔ جب ایک علاقہ یا قوم ترقی پذیر ہوتی ہے' تو اسی زمانے میں کوئی اور علاقہ یا قوم زوال پذیر ہو سکتے ہیں۔

انسانی تاریخ کو مجموعی طور پر ایک عمل کے حوالے سے دیکھنا ابن خلدون نے شروع کیا تھا۔ یعنی مسلمانوں کے زمانے میں دنیا بھر کے تاریخی حوالے بیک وقت مطالعے میں آئے تھے' اور دنیا سکڑنا شروع ہو گئی تھی' جو حدود و قیود وسائل کی کمی کے باعث انسانی ذہن پر عائد ہو گئی تھی وہ ٹوٹنے لگی تھیں' مگر تاریخی طور پر یہ ممکن نہیں تھا کہ شمع ہمیشہ ایک ہی انجمن میں رہتی۔ چنانچہ یورپ نے مسلمانوں سے وہ مشعل حاصل کی' جو انہیں کئی ادوار سے گزرنے کے بعد یونانی اور دوسری تہذیبوں سے ملی تھی۔ مسلمانوں نے یونانیوں کی عظمت کو تسلیم کیا اور ان کے کام کو آگے بڑھایا' لیکن ان کے پاس چونکہ قرآن کی روشنی بھی تھی' لہٰذا انہوں نے یونانی فلسفے پر تنقیدی نظر بھی ڈالی اور دوسری اقوام کی طرح محض افلاطون یا ارسطو کے مقلد ہو کر نہ رہ گئے' پھر استقرائی طریق کار اور تجربہ گاہوں کی وجہ سے بھی انہوں نے ایک نیا رستہ وضع کیا' اور علم کو ایک ایسی ڈگر پر ڈال دیا جس پر وہ آج بھی چل رہا ہے' خود قرآن حکیم کا آٹھواں حصہ غور کرنے اور علمی جدوجہد کرنے کی تلقین کرتا ہے ——— یورپ نے اگرچہ ایک مدت تک مسلمانوں کے

کام کو مشعل راہ بنائے رکھا مگر بعض مذہبی جھگڑوں کی وجہ سے انہوں نے یہ قبول کرنے سے انکار کیا کہ مسلمانوں نے قرون وسطیٰ کے دوران کوئی قابل ذکر خدمت سرانجام دی تھی، جن جھگڑوں کو مذہبی سمجھا گیا ان کے پس منظر میں بھی زیادہ تر دنیاوی اغراض ہی تھیں، اور صلیبی جنگیں بعض تجارتی مراعات حاصل کرنے کے لیے لڑی گئی تھیں، مگر یہ مراعات جب میدانی سطح پر حاصل نہ ہو سکیں تو پھر یورپ سمندروں کی طرف نکل گیا، یہ ایک ایسی دنیا تھی جس میں مسلمانوں نے بعض کارہائے نمایاں تو انجام دیے تھے مگر ان کو سمندر کی اہمیت کا پوری طرح احساس نہ ہوا تھا۔

ترقی کی یہ جنگ ہم نے صرف سمندروں میں نہیں ہاری، بلکہ ہم ہر عملی میدان میں شکست سے دوچار ہوئے ہیں، تاریخ کے جبر (Determinism) کے علاوہ اس کی وجہ فرقہ وارانہ جھگڑے بھی تھے جو خلفا اور سلاطین کے درباروں میں راہ پا گئے تھے، ایک زمانے میں خلفا کے دربار میں اہل علم کی قدر و منزلت ہوتی تھی اور وزرا اور امرا بھی ان کی خدمت کرنا اور ان کے کام کو آگے بڑھانا سعادت خیال کرتے تھے، مگر جب درباروں میں ریشہ دوانیاں شروع ہوئیں تو اس کے اثرات زندگی کے ہر شعبے میں مرتب ہوئے۔ مسلمانوں کی عظیم سلطنت بٹ کر رہ گئی اور ان کے درمیان نفاق نے راہ پا لی، مگر سب سے زیادہ نقصان اس زمانے کی علمی تحریک کو پہنچا، مسلمانوں نے اپنے لیے تحقیق اور تخلیق کی جو راہ متعین کی تھی وہ اس سے بھٹک گئے اور یوں علم کی مشعل غیر محسوس طور پر ان سے چھن گئی۔ ابن خلدون جیسے روشن دماغ دانشور کو جب یہ معلوم ہوا کہ فرانس میں ایک علمی مرکز کام کر رہا ہے، تو اس کے دل میں اس مرکز کے بارے میں جانے کی خواہش بیدار نہ ہوئی اور حیرت انگیز طور پر اس نے یہ سمجھ لیا کہ مغرب والے ہمارے علم میں کیا اضافہ کر سکتے ہیں؟ سترھویں صدی میں جب ہندوستان میں تاج محل تعمیر ہوا تھا اور اسے اب تک دنیا کے عجائبات میں شمار کیا جاتا ہے، اسی زمانے میں نیوٹن کی کتاب پرنسپیا (Principia) بھی شائع ہوئی تھی، مگر یہ آخری تقابل ہے جو ہم کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد سورج نے صرف یورپ کے علاقے میں چمکنا شروع کر دیا تھا اور ہم اپنے اندھیروں سے مطمئن ہو کر بعض مذہبی واہموں میں پناہ تلاش کرتے رہے، اس سے کچھ برس پہلے اکبر کے دربار میں مذہبی مباحث شروع ہو چکے تھے جن کے نتیجے میں "دین الٰہی"

سامنے آیا تھا مگر بوجہ وہ چل نہ سکا' صوفیا کا کردار اگرچہ قابل تحسین خیال کیا جاتا ہے مگر علم و عمل کے سلسلے میں ترقی بالکل رک گئی تھی' انگریز ہندوستان میں قدم جما چکا تھا اور اس نے یہ تہیہ کیا ہوا تھا کہ وہ کسی صورت میں بھی یہاں سائنس اور ٹیکنالوجی کو پھلتے پھولتے ہوئے نہ دیکھے گا۔ وہ صنعتیں جو بنگال میں لگ چکی تھیں اور جدید ترقی کا نقطہ آغاز ثابت ہو سکتی تھیں تباہ کروا دی گئی تھیں' بنگال کا علاقہ جو اس زمانے میں برصغیر کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ علاقہ تھا پسماندہ بنا دیا گیا' اور اس کے بعد بنگال کو جان بوجھ کر غربت کے گڑھے میں پھینک دیا گیا' جس سے نکلنے کی جدوجہد تقسیم شدہ بنگال سے لے کر ابھی تک ہو رہی ہے اور دونوں حصوں کے درمیان اتنے مسائل پیدا کر دیے گئے ہیں کہ ان کا کوئی ممکن حل دور دور تک نظر نہیں آتا۔

یورپ کا یہ رویہ محض مسلمانوں کے سلسلے میں نہیں تھا' بلکہ وہ تمام اقوام جو اس زمانے میں ترقی یافتہ شمار ہوتی تھیں' ہر سطح پر اس کا نشانہ بنیں' ان میں چین' ہندوستان اور جاپان اور تیسری دنیا کے دیگر بہت سے ممالک شامل تھے' یورپ کو ان سب ممالک پر صرف ایک فوقیت حاصل تھی کہ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی اہمیت کا کسی حد تک اندازہ کر چکا تھا' اسی باعث اس کا صدیوں پرانا اور جمود کا شکار جاگیردارانہ معاشرہ ٹوٹنے پھوٹنے لگا تھا اور وہاں صنعتی دور کا آغاز ہو گیا تھا۔ سمندری راستے تلاش کرنے کی جستجو نے یورپ کے لیے کئی نئی زمینوں کے در وا کر دیے تھے' چنانچہ براعظم امریکا' براعظم آسٹریلیا اور دوسرے کئی علاقے اور جزیرے دریافت ہوتے چلے گئے اور سائنس اور ٹیکنالوجی کے ساتھ یورپ کے باشندے دنیا کے کئی علاقوں میں پھیل گئے اور دنیا کے آدھے سے کہیں زیادہ علاقے پر اپنا تسلط قائم کر لیا' مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ احتیاط بھی کی گئی کہ کسی طرح مشرقی ممالک جنہیں اب جنوب (South) کہا جاتا ہے' اپنے پاؤں پر کھڑے نہ ہو سکیں' یہ سبھی کچھ ایک پلان کا حصہ تھا' جس پر یورپ کے تمام ممالک اپنی باہمی چپقلش کے باوجود عمل کر رہے تھے' تجارتی سطح پر ان کو یہ معلوم تھا کہ دوسروں کی پیداوار کو کم سے کم قیمت پر حاصل کرنا ہے اور اپنی پیداوار کی زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کرنی ہے۔

سائنسی ایجادات کی وجہ سے سرمایہ دارانہ نظام کو تقویت ملی' وہ دولت جو جاگیرداری نظام میں صرف الماریوں میں پڑی رہتی تھی گردش میں آ گئی۔ لہٰذا سائنس

کے ذمے یہ فرض بھی پڑ گیا کہ وہ زیادہ سے زیادہ دولت کے حصول کا ذریعہ بنے۔

کوپر نیکس اور گلیلیو کے زمانے میں سائنس اور چرچ کے مابین جو چپقلش شروع ہوتی تھی اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ خود چرچ کی اپنی جاگیریں تھیں اور چرچ نے سرمایہ داری نظام کے خلاف جو جدوجہد کی تھی اس کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ اس نے سائنس کی ترقی کی بھی مخالفت شروع کر دی تھی کیونکہ سائنس کی وجہ سے چرچ کے مفادات متاثر ہو رہے تھے اور پسے ہوئے طبقے میں آزادی کی ایک لہر پیدا ہو گئی تھی' یورپ کے اندر بڑے بڑے بڑے شہر ابھر آئے تھے جہاں صنعت اور تجارت کی ریل پیل تھی' لہٰذا وہ مزارع جنہیں سرف (Serf) کہا جاتا تھا' اب بھاگ کر شہروں کا رخ کرنے لگے تھے کیونکہ وہ جاگیرداری نظام کی بیگار جھیلنے کے لیے اب تیار نہیں تھے۔ نئی نئی زمینیں بھی دریافت ہو چکی تھیں' جہاں آباد کاروں کی اشد ضرورت تھی اور ان کا ایک روشن مستقبل بھی تھا اور ان کی اولاد کے لیے ایسے مواقع بھی تھے جن کا تصور یورپ میں نہیں کیا جا سکتا تھا۔

تاریخی عمل کی یلغار کو روکنا کسی کے بس میں نہیں ہے' تھوڑے بہت بند جو شروع میں باندھے گئے تھے وہ تنکوں کی طرح بہہ گئے اور سرمایہ داری اور سائنس اور ٹیکنالوجی کا ایک سیلاب امڈ آیا' مشرق میں جاگیردارانہ نظام اپنی پوری شدت کے ساتھ موجود تھا اور وہاں کسی قسم کی تبدیلی کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مغرب نے جو جنگ مشرق میں جیتی تھی اس کی وجہ اس کی سائنس اور ٹیکنالوجی تھی' ان کے جدید تر اور زود اثر اسلحے کا کوئی جواب مشرق کے روایت پسندوں کے پاس نہیں تھا اور یہ صورت حال اب بھی کسی نہ کسی حد تک موجود ہے' مگر اب تقسیم مشرق و مغرب کی بجائے شمال اور جنوب میں ہو گئی ہے۔ شمال میں جن ممالک کو شمار کیا جاتا ہے ان کا زیادہ حصہ شمال میں واقع ہے اور جنوب جسے ترقی پذیر ممالک پر مشتمل علاقہ کہا جاتا ہے' روز بروز غربت کے گڑھے میں گرتا چلا جا رہا ہے' اسی کا نام تیسری دنیا بھی ہے' پہلی دنیا مغرب اور ریاست ہائے متحدہ امریکا ہیں دوسری دنیا میں سویت یونین تھی' مگر اب دوسری دنیا کے بارے میں شکوک و شبہات کا اظہار کیا جانے لگا ہے' تیسری دنیا کیا ہے؟ بقول الطاف گوہر "مغرب والے اسے محتاجوں اور نااہلوں کی دنیا کہتے ہیں۔

عرب ممالک کے امرا اسے "عالم الفقیر" کا خطاب دیتے ہیں۔

اور ہم اسے عوام کے دھڑکتے دلوں' اُمڈتی امنگوں اور ناقابل شکست حوصلوں کی دنیا سمجھتے ہیں"۔

یہ الفاظ الطاف گوہر صاحب نے اس وقت کہے تھے' جب وہ تیسری دنیا کے جریدے ساؤتھ کے مدیر اعلیٰ تھے' اور شمال اور مغرب کے مابین مکالمہ ہو رہا تھا' اگرچہ حالات تیسری دنیا کے لیے زیادہ خوش کن نہیں تھے مگر ابھی واہمہ شکنی پوری طرح نہیں ہوئی تھی' مجھے نہیں معلوم کہ اب الطاف گوہر صاحب کے خیالات میں کس قدر تبدیلی آ چکی ہے' مگر یہ یقین ہے کہ تیسری دنیا کے دیگر دانشوروں کی طرح ان کی خواہشات بھی یہی ہوں گی تیسری دنیا اپنے وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے' اقوام عالم میں ایک باعزت مقام حاصل کرے' شروع شروع میں تو یہ خواہش بھی کی گئی تھی کہ پہلی دنیا سے مدد مانگی جائے اور کسی حد تک یہ توقع بھی تھی کہ یہ مدد حاصل کرنے میں دشواری نہیں ہو گی۔ مگر پہلی دنیا نے کہا کہ دوسری دنیا بھی اسس عمل میں ہمارے ساتھ شامل ہو' مگر اشتراکی ممالک کا کہنا تھا کہ چونکہ تیسری دنیا کے سارے زخم پہلی دنیا نے لگائے ہیں' اس لیے مداوا بھی وہی کریں' مگر پہلی دنیا اس کے لیے بالکل تیار نہیں تھی' اس نے تیسری دنیا کی اقتصادیات کو تباہ کرنے کے لیے جو کچھ کیا تھا وہ نہ صرف جاری رہا بلکہ اس میں تیزی آ گئی۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد جب یورپ پوری طرح تباہ ہو چکا تھا' تو امریکا نے مارشل پلان کے تحت دل کھول کر یورپ کی مدد کی تھی' اگر ایسا نہ کیا جاتا تو یورپ ایک زمانے تک اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل نہ ہو سکتا' ہم امریکا کے اس فیصلے کو سراہتے ہیں' مگر یہی رویہ دنیا کے دوسروں خطوں کے ساتھ بھی روا رکھا جانا چاہیے تھا' دنیا کے وہ ممالک جو بری طرح استحصال کا شکار ہوئے ہیں اور ابھی تک شکار ہیں' ان کے سلسلے میں ایسا کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا' بلکہ ایسے حالات بار بار پیدا کیے گئے ہیں کہ وہ غربت کے گڑھے میں گرتے چلے جائیں اور اب تو تیسری دنیا کے کئی ممالک ایسے بھی ہیں جو اپنے قرضے پر سود بھی ادا کرنے کے قابل نہیں ہیں' کیا دنیا کی متمول ملکوں کا یہ فرض نہیں ہے کہ وہ انہیں ترقی کے راستے پر ڈالنے کے لیے ان کی دستگیری کریں' ایسی مدد قبول کرنا کوئی شرمناک فعل بھی نہیں ہے' آخر یورپی ممالک بھی تو اس دور سے گزر چکے ہیں۔

تیسری دنیا' ترقی پذیر دنیا' پس ماندہ دنیا' دنیا بھر کی کل آبادی کے نوے فیصد پر مشتمل ہے' پچھلے کئی عشروں سے انتہائی غربت کی حالت میں ہے اور دنیا کے مشہور جریدے اکانومسٹ (Economist) کے ایک مبصر کے حوالے سے' ان غریب ممالک میں ایسے غریب ترین ممالک بھی ہیں جن کو نہ تو کہیں سے ادھار مل سکتا ہے اور نہ ہی وہ کسی طرح بچت کرنے کے قابل ہیں لہٰذا ان کی در آمد میں روز بروز کمی آ رہی ہے اور مستقبل قریب میں اس بات کا بھی امکان ہے کہ ان کی ساری آبادی قحط کا شکار ہو جائے اور یہ سبھی کچھ اس وقت ہو رہا ہے' جب دنیا کے صنعت یافتہ ممالک اپنے وسائل کو بے پناہ ترقی دے رہے ہیں اور اپنے لیے دولت کے انبار لگا رہے ہیں اور ایسے ایسے ہتھیار بنا رہے ہیں جو کرۂ ارض کو جلد سے جلد تر تباہ کرنے کے قابل ہوں اور دوسری طرف دنیا کی 9/10 آبادی اس قدر غریب ہو چکی ہے کہ ان کے سروں پر قحط کی تلوار لٹک رہی ہے۔

سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس قطبین میں تقسیم شدہ دنیا میں ایک طرف تو غربت اور زوال آمادگی اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے اور دوسری طرف بے پناہ دولت کے ساتھ ساتھ سائنس اور ٹیکنالوجی کے ذرائع ہیں جو انسانیت کے اس طبقے کی بنیادی ضرورت سے کئی ہزار گنا زیادہ ہیں اور یہ اندازہ ان کی موجودہ ضروریات کی سطح سے لگایا گیا ہے۔ یہ مہذب دنیا کا عجیب متناقضہ (Paradox) ہے مگر یہ بہر حال موجود ہے۔ دوسری طرف یہ حقیقت بھی موجود ہے کہ اگر سائنس اور ٹیکنالوجی کے ان ذرائعوں کو غریب ملکوں تک بھی پھیلا دیا جائے' تو پوری دنیا کی کارکردگی اور پیداور کئی ہزار گنا زیادہ ہو سکتی ہے۔ اس کے لیے کرنا یہ ہو گا کہ جو ملک ترقی یافتہ ہیں وہ ان غریب ملکوں سے جہالت دور کرنے میں مدد کریں۔ تعلیم کی روشنی تیسری دنیا کے پس ماندہ ممالک میں بھی پھیلائی جائے' انہیں سائنس اور ٹیکنالوجی کی پیدواری صلاحیت سے روشناس کروایا جائے تاکہ وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں اور خود اس قابل ہو جائیں کہ اپنے قدرتی وسائل کو ترقی دیں' تو غربت اور امارت کا یہ فرق چند سالوں میں ہمیشہ کے لیے مٹ سکتا ہے۔ ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ محض غریب اور پس ماندہ ممالک تعلیم اور سائنس اور ٹیکنالوجی کو ترقی دینے کے بعد ایک ایسی تبدیلی اپنے اندر لے آئے ہیں کہ اب وہ ترقی یافتہ قوموں میں شمار ہوتے ہیں۔

یہ تبدیلی کیسے لائی جا سکتی ہے اور خاص طور پر تیسری دنیا اور خصوصاً پاکستان کو اس سلسلے میں کیا کرنا چاہیے' اس پر ڈاکٹر عبدالسلام نے بہت کام کیا ہے' ان کی کتاب Ideals and Realities جس کا ترجمہ میں نے اردو میں 'ارمان اور حقیقت' کے نام سے کیا تھا' زیادہ تر انہی مباحث پر مشتمل ہے' یہ ایک حیرت انگیز بات ہے کہ ڈاکٹر عبدالسلام جیسا نظریاتی سائنس دان ان مسائل کی نشاندہی کرتا ہے اور پھر ایک ایسا لائحہ عمل بھی بناتا ہے جس پر چل کر تیسری دنیا کی اقوام اپنے آپ کو ترقی یافتہ قوم بنا سکتی ہیں۔

ڈاکٹر عبدالسلام کے خیال میں شمال — جنوب کے مابین سائنس اور ٹیکنالوجی کہ یہ خلیج صنعتی انقلاب کے بعد اس وقت پیدا ہونی شروع ہوئی تھی جب اقتصادی قوت چند مراعات یافتہ قوموں کے ہاتھوں میں چلی گئی مگر اس کے بعد المیہ یہ ہوا کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد بھی جب دنیا میں کالونیاں بنانے والی عظیم سامراجی قوتیں زوال پذیر ہوئیں تو تیسری دنیا کی اقوام کے حق میں اس توازن کو درست نہ کیا گیا' بلکہ حقیقت یہ ہے کہ دولت مند شمال اور غربت میں جکڑے ہوئے جنوب کے مابین یہ تفاوت بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ اس خلیج کے زیادہ ہو جانے کی دو وجوہات ہیں' پہلی تو یہ ہے کہ شمالی جنوب کے وسائل کا استحصال کر رہا ہے اور یہ سامراجی نظام ابھی تک اپنی بدترین شکل میں جاری و ساری ہے بلکہ جنوب کے ابھرتے ہوئے ممالک پہلے سے کہیں زیادہ اس کا شکار ہو رہے ہیں' اس سلسلے میں بھارت اور پاکستان کا ذکر خصوصی طور پر کیا جانا چاہیے' ان علاقوں پر برطانوی عملداری قائم تھی۔ دوسری اہم وجہ یہ ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے لائے ہوئے انقلاب کی وجہ سے یہ خلیج کم نہیں ہوئی بلکہ اس میں اضافہ ہی ہوا ہے۔

شمال کس طرح جنوب کے غریب ملکوں کا استحصال کر رہا ہے' اور ان کی وجہ سے ہی وہ امیر سے امیر تر ہوتا چلا جا رہا ہے اس کی ایک مثال یہ ہے۔

> "میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ پاکستان میں میرے گاؤں میں پیدا ہونے والی روئی کم سے کم مالیت حاصل کر رہی ہے مگر اس کے مقابلے میں درآمد شدہ کھاد کی قیمت زیادہ ہوتی جا رہی ہے۔ پاکستان کے ماہرین اقتصادیات اچھی طرح جانتے ہیں کہ تمام شرائط ہمارے خلاف ہیں' 1955ء اور 1962ء کے درمیان میں ہماری پیداوار کی قیمت سات فیصد کم

ہوئی ہے اور اس دوران در آمدی تیار شدہ آلات کی قیمت میں دس فیصد اضافہ ہوا ہے' پال ہاف مین (Paul Hooffman) اس کو تلافی امداد (Subsidy) کا نام دیتا ہے یعنی غیر ترقی یافتہ غریب ممالک صنعتی طور پر ترقی یافتہ ممالک کی مالی مدد کر رہے ہیں' 1957-58ء میں غیر ترقی یافتہ ممالک نے کل 2.4 بلین ڈالر امداد (Aid) کے طور پر حاصل کیے تھے' مگر انہوں نے 2 بلین ڈالر اپنی پیداوار کی قیمتوں میں کمی اور تیار صنعتی مال کی در آمد میں زیادتی کی وجہ سے ہار دیے ہیں۔

(Bulletin of the Atomic Scientist —— April 1963)

یہ عجیب دنیا ہے جس میں امیر ممالک غریب ممالک کے چیتھڑے اتار کر اپنی زرق برق پوشاک تیار کر رہے ہیں' جو ملک نوآبادیاتی نظام سے آزادی حاصل کرتے ہیں ان کو غربت اور اقتصادی ذلت کے گڑھے میں گرا دیا جاتا ہے۔ نئے نظام میں پاکستان کو 1970ء تک سستی زرعی پیداوار فراہم کرنے کی ذمے داری سونپی گئی تھی' اور ان اشیاء میں زیادہ تر پٹ سن' روئی اور خام چمڑہ شامل تھے۔

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مغرب سے بھی کوئی صاحب شعور دانشور اس رویے کے خلاف احتجاج کرتا ہے مگر اس کا احتجاج بہت ہی کمزور انداز لیے ہوئے ہوتا ہے' اس میں مثال کے طور پر ایڈگر سنو (Edger Snow) اور فیلکس گرین (Felix Greene) وغیرہ شامل ہیں' مگر یہ کام زیادہ تر انقلاب چین کے حوالے سے ہوا ہے' مغرب یہ برداشت ہی نہ کر سکتا تھا کہ کوئی غریب ایشیائی ملک اس کے لیے کسی بھی حوالے سے چیلنج بن سکے' مگر چین کے سلسلے میں امریکا اور روس دونوں ہی خود کو بے بس محسوس کرتے رہے ہیں' پھر سازشوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا' جس میں پوری کوشش کی گئی کہ جو انقلاب چین میں آیا ہے اس کا رخ تبدیل کر دیا جائے اور کوشش کی جائے کہ تیسری دنیا کے ممالک اس سے کوئی اثر قبول نہ کریں۔ یہ بھی خطرہ موجود تھا کہ خود امریکی عوام بھی دنیا میں رونما ہونے والی اس تبدیلی سے متاثر ہو سکتے تھے' لہٰذا اس پروپیگنڈا کے دو رخ تھے ایک بیرونی دنیا کی طرف اور دوسرا امریکی عوام کی طرف۔ لیکن ان سب احتیاطوں کے باوجود نہ حقیقت بیرونی دنیا سے چھپائی جا سکتی نہ امریکی عوام سے۔

فیلکس گرین کی جو کتاب ہمارے ہاں مقبول ہوئی تھی اور جس کا جزوی ترجمہ بھی

اردو میں ہوا تھا' وہ تو The Wall Has two Sides تھی' مگر زیادہ اہم کتاب Gurtain of Ignorance کہی جا سکتی ہے۔ جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ امریکی حکومت اپنے عوام کو کس طرح غلط اطلاعات فراہم کرتی ہے' اسی کتاب میں ڈاکٹر عبدالسلام کے مذکورہ بالا مضمون کا حوالہ تھا اور کم و بیش وہی اقتباس دیا گیا تھا جو اوپر دیا گیا ہے مگر ڈاکٹر عبدالسلام کا نام موجود نہیں تھا۔ صرف یہ لکھا گیا تھا کہ yoحوالہ ایک پاکستانی کے ایک مضمون سے لیا گیا ہے جو بولیٹن آف اٹومک سائینٹسٹ میں شائع ہوا ہے۔ اس وقت تک ڈاکٹر عبدالسلام بین الاقوامی طور پر سائنس کے حلقے سے باہر جانے بھی بہت کم جاتے تھے اور یہ کتاب شائع بھی پہلی بار 1965ء میں ہوئی تھی۔

تیسری دنیا کو سائنس کی ترقی کے لیے کیا کرنا چاہیے اور کیوں کرنا چاہیے' اس کا ایک شعور پاکستان میں ایک محدود سے حلقے کو شروع ہی سے تھا' مگر ان کی کبھی سنی نہیں گئی۔ پاکستان کا پہلا پنج سالہ منصوبہ بھی اس کا غماز تھا مگر اس سے فائدہ کوریا نے اٹھایا تھا۔ اس سلسلے میں تھوڑی بہت جو کوشش نظر آتی ہے وہ ایوب خان کے زمانے تک محدود ہے' 1992ء میں ڈاکٹر عبدالسلام کی ایک سوانح ہندوستان میں شائع ہوئی ہے' اس کے مولف جگجیت سنگھ (Jogjit Singh) نے ایک واقعہ لکھا ہے' جسے میں اپنے الفاظ میں بیان کرتا ہوں۔

اس زمانے میں ڈاکٹر عبدالسلام نے پاکستان کی سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے لیے ایک پلان بنایا تھا' وہ اس وقت ایوب خان کے سائنسی مشیر تھے' ان کا مسئلہ یہ تھا کہ سائنسی اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے لیے حکومتی امداد انتہائی ناکافی تھی' ان کو یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ ان کا ملک اتنی دیر تک ترقی نہیں کر سکتا' جب تک پاکستان اپنے دفاعی اخراجات کم نہ کرے اور یہ دفاعی اخراجات اس وقت تک کم کیے ہی نہ جا سکتے تھے' جب تک ہندوستان بھی اس کے لیے تیار نہ ہو جائے۔ اس موضوع پر گفتگو کرنے کا ایک موقعہ 1964ء میں اس وقت نکل آیا جب اودھے پور میں پگواش (Pugwash) سائنس کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کی میزبانی ہندوستان کے مشہور سائنس دان ڈاکٹر ہومی بھابھا (Dr.Homi Bhabha) نے کی' جو انڈین اٹومک انرجی کانفرنس کے صدر نشین تھے' بھابھا اور ڈاکٹر سلام نے یہ پلان بنایا کہ برصغیر میں اسلحے کی دوڑ ختم کرنے کے لیے ایوب خان اور

پنڈت جواہرلال نہرو کی ایک ملاقات کروائی جائے' ان کی یہ خواہش بھی تھی کہ ان ممالک کے درمیان جو متنازعہ معاملات موجود ہیں' ان کے حل کی بھی کوئی صورت نکالی جائے۔ دہلی سے واپس لاہور آتے ہوئے ڈاکٹر سلام سارا راستہ کھڑے رہے کیونکہ جہاز اس قدر بھرا ہوا تھا کہ اس میں بیٹھنے کی جگہ ہی نہیں تھی' اگرچہ ایوب خان سے ملنے کے لیے انہوں نے کوئی وقت نہیں لیا ہوا تھا مگر کسی نہ کسی طرح انہوں نے اس ملاقات کا موقعہ حاصل کر ہی لیا' ایوب خان نے بتایا کہ پنڈت نہرو کبھی اس ملاقات پر راضی نہیں ہو گا کیونکہ اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہے' پنڈت جی نے زبردستی سے اور تقسیم کے سلسلے میں ان تمام متفقہ اصولوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے جو برصغیر کی تقسیم کے وقت تسلیم کیے گئے تھے' مسلم علاقے جموں اور کشمیر پر قبضہ کر لیا ہے۔ اگرچہ انہوں نے یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ وہ استصواب رائے کروائیں گے تاکہ کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ ہو سکے مگر اس پر بھی انہوں نے عمل نہیں کیا' ایوب خان بھی ان وجوہات کی بنا پر پنڈت جی سے ملنا نہیں چاہتے تھے' مگر کسی نہ کسی طرح ڈاکٹر سلام نے ان کو راضی کر ہی لیا مگر بدقسمتی سے بھابھا پنڈت جی کو منانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

اس واقع کی توجیہات تو بہت ہو سکتی ہیں مگر موجودہ مضمون کے دائرہ کار کے حوالے سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ برطانیہ نے لارڈ مونٹ بیٹن کے ذریعے جان بوجھ کر اس تنازعے کو پیدا کیا تھا' تاکہ دنیا کے دونوں نو آزاد ملک ایسے مسائل میں الجھ جائیں کہ ان کے پاس سائنس اور ٹیکنالوجی کو ترقی دینے کے وسائل ہی باقی نہ رہیں' یہ بات اب ثابت ہو چکی ہے کہ لارڈ مونٹ بیٹن نے اکتوبر 1947ء سرینگر میں جب فوج اتاری تھی تو اس کے پاس اس کا کوئی قانونی' اخلاقی یا سیاسی جواز نہیں تھا۔

مسئلہ صرف اس قدر نہیں ہے کہ شمال کے ممالک تیسری دنیا کے ممالک کی مدد نہیں کرتے بلکہ وہ پوری کوشش کرتے ہیں کہ ان ممالک میں سائنس کو ترقی دینے کی صورت حال پیدا ہی نہ ہو' برصغیر کے حوالے سے میں ایک اور واقعہ بھی بیان کرنا چاہتا ہوں' پنڈت نہرو کے سامنے سوال یہ تھا کہ وہ ہندوستان میں صنعتیں لگانے کے لیے کس حکمت عملی پر عمل کرے' اس نے اس سلسلے میں کیمبرج کے پروفیسر بلیکٹ (Prof : Blackett) سے مشورہ کیا تو پروفیسر نے پنڈت جی سے کہا سائنس اور ٹیکنالوجی کو

بھارت میں ترقی دینے کی کیا ضرورت ہے' آپ نئی مشینری شلف سے بھی خرید سکتے ہیں۔ پنڈت جی نے یہ مشورہ مان لیا اور ہندوستان کی سائنسی ترقی کوئی دس برس کے لیے بری طرح متاثر ہوئی' مگر ہم نے پاکستان میں اس مسئلے پر کبھی سنجیدگی سے غور ہی نہیں کیا' بلکہ پوسٹ گریجوایٹ طلبا کی مدد کے لیے 180 ملین روپے کی جو امداد دی جاتی تھی اس کو مکمل طور پر بند کر دیا گیا ہے' اور یہ واقعہ بدقسمتی سے اسی سال پیش آیا ہے۔ اس سلسلے میں یقیناً کچھ مسائل ہوں گے' ممکن ہے یہ رقم ٹھیک طرح صرف نہ ہوتی ہو مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ آئندہ نسلوں پر سائنسی تحقیق کے دروازے ہی بند کر دیے جائیں اور دوسری بدقسمتی یہ بھی ہے کہ خود ملک کے اندر سائنسی تحقیق کی کوئی بہت روشن مثال موجود نہیں ہے بلکہ ایک اطلاع کے مطابق یونیورسٹیوں کے سائنس کے شعبے سنجیدگی سے کام کرنے کو تیار نہیں ہیں' اور پھر جو رقم اس مد میں سے بچائی گئی ہے وہ شعبہ تعلیم کو دی بھی نہیں گئی ممکن ہے اس سے کسی وزیر کے لیے کوئی بیکار ہوائی جہاز خرید لیا گیا ہو۔

ایک طرف تو ہم اپنا قیمتی زرمبادلہ سامان تعیش پر ضائع کر رہے ہیں' دوسری طرف شمال کے ممالک ہمیں سنبھلنے کا موقعہ ہی نہیں دے رہے' جمیکا (Jamaica) ویسٹ انڈیز کے سابق وزیراعظم مائیکل مین لے (Michal Manley) جو الطاف گوہر کے رسالے 'ساؤتھ' میں باقاعدگی سے ان مسائل پر لکھتے رہے ہیں' کہتے ہیں' 1950 میں دس ٹن چینی کے عوض جمیکا کا کسان ایک فورڈ ٹریکٹر حاصل کرتا تھا' مگر 1970ء میں وہی ٹریکٹر 25 ٹن چینی کے عوض ملنے لگا ہے' کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ جمیکا کا کسان فورڈ پلانٹ میں کام کرنے والے مزدوروں کے سوشل سیکورٹی اور بہبود کے سو فیصد اخراجات ادا کرتا ہے؟ تمام ترقی پذیر ممالک میں پیدا ہونے والی اشیا صنعتی نرخوں کی دوڑ کے مقابلے میں بہت پیچھے رہ گئی ہیں' دوسرا اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ ترقی پذیر ممالک کے لیے کسی طرح کی عملی حکمت عملی بنانا ممکن ہی نہیں ہے' کیونکہ' شمال کے ممالک اچانک اپنی قیمتیں بڑھا دیتے ہیں۔ نرخوں میں اس اضافے کو سٹاک ایکسچینج کے بدلتے ہوئے رجحانات کے حوالے سے بیان کیا جاتا ہے' یہ ایک طرح کی لوٹ کھسوٹ ہے جس کی ترقی یافتہ ممالک کے سرمایہ داروں کو کھلی اجازت ہے۔

اس مسلسل استحصال کی وجہ سے جو شمال' جنوب پر روا رکھے ہوئے ہے آمدن اور کھپت میں انتہائی غیر متوازن صورت حال پیدا ہو گئی ہے۔

"دنیا کی تین چوتھائی آمدن' سرمایہ کاری' خدمات اور دنیا بھر میں ہونے والی ہر طرح کی تحقیق دنیا کے ایک چوتھائی لوگوں کے ہاتھ میں ہے' وہ دنیا کی بڑی بڑی معدنیات کا 78 فیصد اپنے استعمال میں لاتے ہیں' اور صرف اسلحے کی شکل میں اتنا کچھ بناتے ہیں جو باقی ساری دنیا میں بننے والے اسلحے کے برابر ہے۔

1970ء میں دنیا کے امیر ترین ایک ارب لوگوں کی آمدن 3000 ڈالر فی کس سالانہ تھی اور دنیا کے غریب ترین لوگ 100 ڈالر سالانہ فی کس کما رہے تھے اور اس کا خوفناک ترین پہلو یہ ہے کہ مستقبل میں بھی ان حالات کے بدلنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ کوئی ایسا عمل جاری ہونے کی توقع بھی نہیں ہے جو اس تفاوت کو دور کر سکے —— جو ترقی دنیا میں اس وقت ہو رہی ہے وہ ایک روایتی انداز لیے ہوئے ہے' خیال یہ ہے کہ اس ترقی کی وجہ سے 1980ء تک غریب لوگوں کی سالانہ آمدن فی کس ایک سو ڈالر کی بجائے بڑھ کر 103 ڈالر ہو جائے گی' جبکہ وہ امیر آبادی جو 1970ء میں 3000 ڈالر سالانہ فی کس کما رہی ہے' 4000 امریکی ڈالر کمانے لگے گی' یعنی تین ڈالر کے مقابلے میں ایک دہائی کے اندر ان لوگوں کی آمدن میں 1000 ڈالر سالانہ کا فی کس اضافہ ہو جائے گا۔

"Diseases of the Rich and Discases of the Poor." - Dr. Salam.

اس بات میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ موجودہ اقتصادی نظام اور طریقہ کار کو غریب اقوام ایک شر انگیز فراڈ قرار دیتی ہیں' اس نظام کی وجہ سے غریب اقوام پر پچھلے بیس برس میں 120 بلین ڈالر کا قرضہ چڑھ گیا ہے' حالانکہ جو ایلوکیشن (Allocation) ان کو کی گئی ہے وہ پانچ فیصد سے زیادہ نہیں تھی' اس نظام کے تحت دنیا بھر کی اشیا پیداوار سے 200 بلین ڈالر حاصل ہوتے ہیں مگر ان کا صرف چھٹا حصہ بنیادی اور اصل پیدا کرنے والے تک پہنچتا ہے' باقی پانچ حصے امیر ممالک کے ڈسٹری بیوٹر اور مڈل مین کی جیب میں چلے جاتے ہیں۔ یہ ایک ایسا نظام ہے جس نے 1991ء میں سات بلین ڈالر کی امداد غریب

ممالک کو دی ہے اور ٹھیک یہی رقم ان کی پیداوار کی قیمت کم کر کے وصول کرلی ہے' " چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے"۔

غریب ممالک کہتے ہیں کہ جس شے کو ایڈ یا مدد کا نام دیا جاتا ہے' وہ اصل میں ہماری ہی چھنی ہوئی رقم ہے' جو جزوی طور پر ہم کو لوٹا دی جاتی ہے۔ غریب ممالک کے دو بنیادی مسائل ہیں' ایک تو تعلیم کی کمی ہے جس کی وجہ سے مسائل کے بارے میں شعور کا فقدان ہے' دوسرے یہ بدقسمتی بھی ہے کہ ان کے درمیان جو مسائل مختلف سیاسی اور اقتصادی وجوہات سے پیدا ہوتے ہیں' ان کو بھی یہ ممالک حل نہیں کرپاتے' لہٰذا ان میں مفاہمت کا فقدان بھی پیدا ہو گیا ہے' ایک اندازے کے مطابق اگر جنوب کے ممالک آپس میں بہتر لین دین کریں اور سائنس اور ٹیکنالوجی کے سلسلے میں ایک دوسرے کی مدد کریں تو بھی ان کے بہت سے مسائل حل ہو سکتے ہیں' اگر ہم اپنے سائنس دانوں کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے ہندوستان بھجوائیں اور ہندوستان بھی ان شعبوں میں تربیت کے لیے ہمارے پاس اپنے طلبا بھیجے جس میں ہم ترقی یافتہ ہیں' تو دونوں کے اخراجات میں بے حد کمی ہو سکتی ہے' اس مفاہمت میں دوسرے ممالک بھی شامل ہو سکتے ہیں' ایک دوسرے کی مدد سے صنعتیں بھی لگ سکتی ہیں' یہ ضروری تو نہیں ہے کہ ہم تمام صنعتوں کے لیے امریکی سرمایہ ہی تلاش کریں' مگر اس کے لیے ضروری ہو گا کہ یہ ممالک متنازعہ معاملات کو عدل کی بنیاد پر حل کریں' 1996ء میں ہونے والے کرکٹ ورلڈ کپ سے ایک نئے دور کا آغاز کیا جا سکتا ہے' بشرطیکہ آپس میں وہ رویہ اختیار نہ کیا جائے جو شمال والے جنوب کے سلسلے میں روا رکھے ہوئے ہیں۔ یو این او میں بھی مفادات کی سیاست کی بجائے عدل کا دور دورہ ہونا چاہیے' قوم بڑی ہو یا چھوٹی اس کو ایک ہی نظر سے دیکھا جانا چاہیے' امیر ممالک کی منطق بھی عجیب ہے جب وہ انسانی حقوق کی بات کرتے ہیں تو فرد یا چھوٹے سے گروہ کی سطح پر آجاتے ہیں' مگر جب قوموں کا معاملہ پیش نظر ہو تو انسانی حقوق کی بجائے پانچ بڑوں کی ویٹو پاور استعمال میں آجاتی ہے' بھارت کو چھٹا ویٹو پاور والا ملک بننے کی بجائے یہ کوشش کرنی چاہیے کہ ویٹو کا حق ہی ختم ہو جائے تاکہ سلامتی کونسل سے بنیادی انصاف حاصل کیا جا سکے۔

ایک اور بے حد اہم وجہ جس کے باعث شمال اور جنوب میں خلیج بڑھتی جارہی ہے

حال میں رونما ہونے والا انفیاطیاتی (Cybernetical) یا معلوماتی Informatic انقلاب ہے' اس کا موازنہ انیسویں صدی میں رونما ہونے والے صنعتی انقلاب کے سماجی اثرات سے کیا جا سکتا ہے' مثال کے طور پر ان بعید حسیاتی مواصلات (Remote Sensing Communications) ہی کو لیجئے جو اس معلوماتی انقلاب میں بروئے کار آئے ہیں۔ یہ ایک پیچیدہ نظام ہے جو زمین کے گرد چکر لگانے والے سٹلائیٹس (Satellites) میں نصب کیا جاتا ہے' اس میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ کرۂ ارض کی معدنی دولت' تازہ پانی کے پوشیدہ ذخائر' زراعت اور ماہی گیری کے وسائل کے بارے میں معلومات حاصل کر کے ان کا تجزیہ بھی کر سکتا ہے' اس کی مثال یہ ہے کہ جب یہ اطلاعات ایک چھوٹے سے گروہ کے ہاتھ میں آ جاتی ہیں اور اس گروہ کے پاس کان کنی کی کثیر الاقوامی کارپوریشنیں بھی ہوتی ہیں اور فوجی طاقت بھی ہوتی ہے' مگر یہ معلومات اگر خود تیسری دنیا کے پاس ہوں تو وہ اس کی ترقی میں فیصلہ کن کردار ادا کر سکتی ہیں' اگرچہ اقوام متحدہ کے مختلف ادارے اس بات کے پابند ہیں کہ وہ ان معلومات کو متعلقہ ممالک تک پہنچائیں مگر ایسا ہو نہیں پاتا' اور اس کا بدترین پہلو یہ ہے کہ 1972ء میں سٹاک ہوم میں ہونے والے ماحولیات کی کانفرنس میں مسائل کا ایک اور گروہ پیدا ہو گیا ہے ان مسائل کا تعلق زمین کے گرد تنے ہوئے حیاتیاتی کرے کے ساتھ ہے' یہ وہ خطرات ہیں جو بڑھتی ہوئی صنعت کاری اور غیر محتاط ٹیکنالوجی کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔

حیاتیاتی کرے (Biosphere) کی اصطلاح ایک فرانسیسی ماہر حیاتیات لے مارک (Lamarck) نے 1802ء میں وضع کی تھی' اس میں کرۂ ارض پر آباد تمام زندہ نامے (Orgnism) شامل ہیں' مگر اس کا پہلا سنجیدہ مطالعہ وی آئی ورڈناسکی (V.I. Verdnasky) نے سو برس کے بعد 1926ء میں شروع کیا تھا۔ اس کا یہ کام 1965ء تک جاری رہا' اس نے اس مطالعے کے دوران ایک اصطلاح نو اوسفیر No-Osphere متعارف کروائی - نو - اوس (No-Os) یونانی زبان میں ذہن (Mind) کو کہتے ہیں' اس نے نو اوسفیر کو بیوسفیر کہا تھا مگر اس وقت جب یہ مکمل طور پر انسانی ذہانت کی گرفت میں ہو' اور اس سے مادی اور روحانی ضروریات کی تشفی حاصل ہوتی ہو' یہ ایک انتہائی رجائیت پسندانہ نظریہ تھا مگر اصل صورت حال جو مجموعی انسانی ذہانت نے پیدا کر دی تھیں' اس نظریے کے

بالکل مخالف تھی' ان تبدیلیوں کی وجہ سے جو قنوطی صورت حال پیدا ہوئی تھی اس کا پرزور اظہار 1972ء میں کلب آف روم (Club Of Rome) نے ایک رپورٹ میں کیا ہے جس کا نام نشوونما کی حدود (Limits of Growth) ہے' اس رپورٹ میں عالمی آبادی کے رجحانات' آلودگی اور عسرت وسائل (Depletion of resourses) کے مختلف پہلوؤں کا ذکر ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق صرف چند برس ہی ایسے باقی رہ گئے ہیں' جن میں حالات کو درست کیا جا سکتا ہے' اس کے بعد جو کچھ ہو چکا ہو گا اسے بدلنا ممکن نہیں ہو گا۔

اس رپورٹ نے سائنس دانوں کے اندر ڈرامائی طور پر احساس زیاں پیدا کر دیا تھا۔ چنانچہ دنیا کے کئی سائنس دانوں نے جن میں پاکستانی سائنس دان ڈاکٹر عبدالسلام بھی شامل تھے۔ ساری دنیا کی اقوام سے یہ اپیل کی تھی کہ وہ اپنے جھگڑوں اور اختلافات کو بھول جائیں اور ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر اسلحے کی دوڑ' آبادی کے تیزی سے بڑھتے ہوئے رجحان' جنگلات کی روز افزوں بڑھتی ہوئی کٹوتی' غیر ذمے دارانہ صنعتی رویے وغیرہ پر قابو پائیں تاکہ حیاتیاتی کرے کو مکمل طور پر تباہ ہونے سے بچایا جا سکے اور دنیا کی تمام اقوام کے لیے ترقی کے مواقع پیدا کیے جا سکیں۔

ہم سب ایک ہی سیارے پر آباد ہیں' اگرچہ ہم انسانوں نے خود کو ممالک اور اقوام میں تقسیم کر رکھا ہے مگر یہ کرہ ارض تو تقسیم نہیں ہو سکتا' اس لیے ضروری ہے کہ جو علاقے ترقی یافتہ ہو چکے ہیں وہ ان علاقوں اور قوموں کی مدد کریں جو ابھی ترقی پذیری کے عمل میں ہیں۔ پہلے بھی مارشل پلان کا ذکر آ چکا ہے جس کی مدد سے یورپ پانچ سال کے اندر اندر اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا تھا اور یہ واقعہ دوسری جنگ عظیم کے بعد کا ہے' امریکا نے 32 بلین ڈالر کی امداد یورپی ملکوں کو دی تھی یہ ان کی مجموعی قوامی آمدنی (G.N.P) کا 2.79 فیصد تھا' یہ بہت بڑی فیاضی تھی جو دنیا کے کسی بھی ملک نے دوسروں کے لیے کی تھی مگر اس کے پیچھے بھی ایک خود غرضی کام کر رہی تھی ریاست ہائے متحدہ امریکا کو اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ مغرب کی مجموعی خوشحالی کے لیے یہ مدد فراہم کر رہا ہے اور بالاخر اسی فیصلے سے امریکا کی خوشحالی بھی متعلق کی جاتی تھی۔

مگر مارشل پلان سے پہلے خود امریکا کے اندر ایک حکمت عملی وضع کی گئی تھی جسے

نیو ڈیل (New Deal) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم سے پہلے ایک مقتدر ماہر اقتصادیات جے ایم کینز (J.M. Keyenes) نے حکومت سے کہا تھا کہ 1930ء کی عالمی کساد بازاری کے بعد جو مندا اور بے روزگاری پیدا ہو گئی ہے اس کو دور کرنے کے لیے وہ کچھ خرچہ کرے' اس نے یہ ثابت کیا تھا کہ حکومت کے اس اقدام کے بعد لوگوں کی قوت خرید میں بہتری پیدا ہو گی اور اقتصادیات بہتر ہو جائے جس کی وجہ سے بے روزگاری کا خاتمہ کرنے میں مدد ملے گی۔ مارشل پلان اور نیوڈیل دونوں بے حد کامیاب رہے تھے اور خصوصاً مارشل پلان جس نے ساتویں اور آٹھویں دہائی تک امریکی امداد کی مدد سے یورپ میں وہ خوشحالی پیدا کر دی تھی جس کی تاریخ میں کوئی مثال موجود نہیں ہے۔

ایسی ہی کوئی کوشش شمال کے امیر ممالک بھی کر سکتے ہیں تا کہ غریب جنوب کی ایسی مدد ہو سکے' جس سے وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے اگر مارشل پلان کو مدنظر رکھا جائے تو یہ ممالک اپنی قومی آمدن کا 2.79 فیصد اس مد میں صرف کریں' کیونکہ یہی سلوک یورپ کے مغربی ممالک سے ہوا تھا' اور اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو دنیا کا اقتصادی منظر یکسر مختلف ہو سکتا تھا چنانچہ دنیا کی سترہ امیر ترین اقوام نے اپنے جی این پی کا 0.52 فیصد 1960 میں ادا کرنا قبول کیا مگر 1974ء میں اسے گھٹا کر 0.3 فیصد کر دیا گیا' حیرت کی بات ہے کہ اس مد میں سویڈن نے تو اپنے جی این پی کا 0.72 ادا کیا مگر امریکا اور انگلستان 0.3 اور 0.25 سے علی الترتیب آگے نہ بڑھ سکے' اور 1980 تک امیر ممالک کی امدادی شرح 0.28 فیصد رہ گئی اور اس میں امریکا کی امداد صرف 0.18 فیصد تھی۔ ان شماریات سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے کہ جنوب کو جان بوجھ کر غربت کی ایک خاص سطح پر رکھا جا رہا ہے' ان ممالک کو اس قابل ہونے ہی نہیں دیا جاتا کہ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی کر سکیں اور اس پر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جن ممالک نے سائنس کی ترقی میں ذرہ بھر بھی خدمت انجام نہیں دی ان کی مدد کرتے چلا جانا آخر کیوں ضروری ہے' بعض انتہا پسند تو یہ بھی سوچتے ہیں کہ آیندہ جن انسانی نسلوں کو زندہ رکھا جائے' ان میں صرف وہی لوگ شامل ہوں جو ترقی کی اس دوڑ میں شریک ہیں۔

مگر یہ بھی سوچنا چاہیے کہ اگر مارشل پلان کے تحت ترقی کے راستے پر گامزن ہونے والا یورپ امریکا کے لیے مددگار ثابت ہوا ہے تو پھر یہ شبہ کرنے کی کیا وجہ ہے کہ

جنوب کے ممالک ترقی پانے کے بعد وہی کچھ نہیں کریں گے' ولی برانٹ (Willy Brandt) نے کہا تھا۔

"مفادات کا اشتراک واضح طور پر توانائی' اشیاء کی پیداوار اور تجارت' خوراک اور زراعت' مالی معاملات' افراط زر پر قابو پانے اور زمین اور خلا کے مابین مواصلات میں حاصل کیا جا سکتا ہے۔ پھر یہی اشتراک ان وسائل میں بھی جاری رہ سکتا ہے جن کی تجدید ممکن ہے یا ممکن نہیں ہے اور یہ کام پورے کرہ ارض کے سلسلے میں مجموعی طور پر کیا جا سکتا ہے' اس میں ماحولیاتی (Ecological) اور ہمارے اردگرد پھیلے ہوئے دنیا کے مسائل آتے ہیں' اس میں سمندر کے وسائل کو بروئے کار لانا بھی شامل ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ جب اس طرح کا تعاون حاصل ہو جائے تو اسلحے کی دوڑ بھی روکی جا سکتی ہے جو نہ صرف ہمارے وسائل کو نگل رہی ہے بلکہ پوری انسانیت کے لیے خطرہ بنی ہوئی ہے اور اس سے امن کے لیے مسائل بھی پیدا ہو رہے ہیں اور اگر دنیا کے مکمل فلاح کو مجموعی طور پر سامنے نہ رکھا گیا تو یہ مسائل زیادہ تشویش ناک صورت حال اختیار کر سکتے ہیں۔

دنیا کے زیادہ تر صنعتی ممالک نے ان دنوں میں بھی جن ان کی تجارت اپنی انتہا کو چھو رہی تھی کبھی یہ سوچا ہی نہیں کہ وہ انسانیت کی فلاح کے لیے متفقہ طور پر قبول کیا گیا اپنا کم سے کم حصہ ہی ادا کر دیں۔ یہ ریکارڈ نہ صرف مایوس کن ہے بلکہ ہمیں یہ بھی یاد دلاتا ہے کہ اگر یہ ہدف حاصل ہو جاتے تو بہت سے ترقی پذیر ممالک زیادہ اشیاء اور خدمات درآمد کر سکتے اور یوں شمال کی وہ مشکلات بھی کم ہو جاتیں جو اسے اس وقت درپیش ہیں۔"

اقتصادی ترقی کے لیے ہم ایک دوسرے پر انحصار کرتے ہیں' انیسویں اور بیسویں صدی میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کی وجہ سے جو ایک دوسرے پر اقتصادی انحصار پیدا ہوا ہے' اس میں دنیا کے تمام ممالک شامل ہیں۔ مگر اس ترقی کے دوران ہم نے جو سبق سیکھا تھا اب اسے جان بوجھ کر بھلایا جا رہا ہے' مثال کے طور پر سرمایہ دار ممالک کے اندر سرمایہ دار اور محنت کش طبقے کے درمیان طویل عرصے تک ایک تلخ جدوجہد

جاری رہی ہے' مگر جب محنت کش طبقے کی اجرتوں میں اضافہ ہوا ہے تو اس اضافے کی وجہ سے خوشحالی بھی بڑھی ہے اور مجموعی طور پر اقتصادی صورت حال میں بہتری پیدا ہوئی ہے۔

یہی کچھ جنوبی کے سلسلے میں بھی ہو گا اگر شمال اپنے رویے میں تبدیلی پیدا کرے' اس بات کو کسی حد تک ایک ممکنہ مثال سے سمجھا جا سکتا ہے اس وقت جاپان ایک خاص رفتار سے صنعتی ترقی کے عمل میں ہے' ایک اندازے کے مطابق یہ شرح سات فیصد سالانہ کے قریب ہے' اگر جاپان اس شرح کو جاری رکھتا ہے تو چند برس میں اس کی پیداوار اتنی زیادہ ہو جائے گی کہ اس کی کھپت کے لیے موجودہ منڈیاں کافی نہ ہوں گی' اگر جاپان اس شرح میں کمی کرتا ہے تو اس کی اقتصادی ترقی بری طرح متاثر ہو سکتی ہے' اور پھر ایسی صورت حال بھی پیدا ہو سکتی ہے کہ اقتصادی طور پر خود اس کے لیے الجھنیں پیدا ہو جائیں' مگر دوسری طرف سوال یہ ہے کہ مزید کھپت کہاں ممکن ہے؟ اگر تیسری دنیا کے ممالک میں سائنسی بنیادوں پر ترقی نہ ہوئی اور وہ اس قابل نہ ہو سکے کہ مزید درآمد کا بوجھ اٹھا سکیں تو جاپان سمیت باقی سرمایہ دار ممالک کی پیداوار کی کھپت کے لیے بہت سے مسائل پیدا ہو جائیں گے' اس کا موازنہ آپ اسی صورت حال سے کریں جو سرمایہ دار اور محنت کش طبقوں کے درمیان پیدا ہوئی تھی' جب محنت کش طبقہ خوش حال ہوا تو سرمایہ داری نظام مضبوط ہوا' اگر ایسا نہ ہو پاتا تو دنیا بھر میں اشتراکی نظام آ چکا ہوتا اور شاید اشتراکی نظام کی موجودہ ناکامی کی وجہ بھی یہی ہے کہ ان کا محنت کش طبقہ خوش حال نہیں ہو سکا تھا' اس کی وجوہات کچھ بھی ہوں مگر یہ ممکن نہیں ہے کہ کسی نظام کو محض نعروں اور واہموں (ILLUSION) کی مدد سے دیر تک چلایا جا سکے۔ سرمایہ داری کو آخر کار یہ تسلیم کرنا پڑا کہ مزدور کے بھی کچھ حقوق ہوتے ہیں' اسی طرح شمال کو بھی کبھی نہ کبھی یہ اندازہ ضرور ہو جائے گا کہ جنوب کے بغیر وہ چل نہیں سکتا۔ ہر بار مسائل کا حل یہ نہیں ہوتا کہ دوسروں کو قتل کر دیا جائے یا ان کے حقوق مکمل طور پر غصب کر لیے جائیں۔ امریکا میں قدیم مقامی آباد کے ساتھ انتہائی ناروا سلوک کیا گیا اور بیشتر آبادی کو قتل کر دیا گیا مگر اب ایسا کرنا ممکن نہیں ہے اور ریڈ انڈینز (Red Indians) کے اندر آزادی کی تحریک آہستہ آہستہ جنم لے رہی ہے' اور وہ فی الحال امریکی معاشرے کا حصہ

بننے کو تیار نہیں ہیں۔ کچھ آوازیں ایسی بھی سنائی دیتی ہیں جو اپنے لیے زمین کا ٹکڑا الگ مانگ رہی ہیں۔

یہ بات کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ شمال اور جنوب کے مابین جو خلیج اس وقت موجود اسے پاٹنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس کے بغیر دنیا میں امن قائم نہیں ہو سکتا' جیسا کہ جے ٹن برگن (J. Tin Bergen) نے کہا ہے یہ ضروری ہے کہ جنوب کو ٹیکنالوجی منتقل کی جائے کیونکہ ایسا کرنے ہی سے جنوب اس قابل ہو گا کہ وہ شمال سے درآمد میں اضافہ کر سکے' اور ایسا کرنے ہی سے دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں بیروزگاری کم ہو گی اور سوشل سیکورٹی کی وجہ سے ان پر روزافزوں بڑھنے والا مالیاتی بوجھ کم ہو گا۔ لہٰذا عالمی پیمانے پر کی نے سین (Keynesian) رویے کو فروغ دینے کی ضرورت ہے کیونکہ یہ واحد طریقہ ہے جس سے دونوں گروہ ایک دوسرے کے لیے بہتری پیدا کر سکتے ہیں۔

ایک اور' نہایت اہم سوال یہ بھی ہے کہ اب جو کچھ مغربی ممالک کے پاس ہے اس کا بہت سا حصہ انیسویں صدی میں آج کے ترقی پذیر ممالک سے استحصال اور لوٹ مار کے ذریعے حاصل کیا گیا ہے اور صحیح معنوں میں اسی پر ان ممالک کی خوشحالی کی بنیاد رکھی گئی ہے' میں پہلے بھی گزارش کر چکا ہوں کہ دوسری دنیا جو اشتراکی ممالک پر مشتمل ہے یہ کہتی ہے کہ چونکہ استحصال پہلی دنیا نے کیا ہے' لہٰذا اب سدباب بھی وہی کریں' لہٰذا اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ان کے کھوئے ہوئے وسائل ان کو واپس کر دیے جائیں' مگر صرف گھوڑی واپس کرنا کافی نہیں ہو گا' اس گھوڑی نے جو بچے دیے ہیں ان پر بھی جنوب کے غریب ممالک کا حق ہے' سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی بھی ان وسائل کے ساتھ متعلق ہے جو شمال اپنے استعمال میں رکھے ہوئے ہیں۔ لہٰذا ان وسائل کے ساتھ ٹیکنالوجی بمعہ سائنس واپس کرنی چاہیے۔

محض ٹیکنالوجی دینے سے مسئلہ حل نہیں ہو گا۔ ٹیکنالوجی ایسی توپ کی طرح ہو گی جس کا گولہ ہمیشہ درآمد کرنا پڑے گا۔ لہٰذا گولہ بنانے کی سائنس بھی جنوب کے ممالک کے پاس ہونی چاہیے۔ اب جنوب میں ایسے کئی ممالک ہیں جو سائنس میں اس قدر ترقی یافتہ ہیں کہ ان کو ٹیکنالوجی بمعہ سائنس منتقل ہو سکتی ہے' شمال جو علم کی ترقی اور تحقیق کا دعوے دار ہے پرانے حکیموں کا سا رویہ اپنائے ہوئے ہے' سائنس کسی بھی قوم کا خاندانی

نسخہ نہیں ہے' جسے اس قوم تک محدود رکھا جائے' دنیا میں جس قدر بھی ترقی ہوئی ہے وہ کرۂ ارض اور انسانی نسل کی ترقی ہے اور اسے رنگ و نسل کی بنیاد پر تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ اس تفاوت کو دیر تک قائم رکھا جا سکے جو اس وقت اقوام عالم میں موجود ہے' اس کے دو ہی نتائج نکل سکتے ہیں یا تو رفتہ رفتہ یہ تفاوت دور ہو گا یا دنیا بہت بڑی تباہی سے دوچار ہو گی۔

اسکے باوجود کہ یہ کرۂ ارض عملی طور پر ایک ہی نوع (Species) کے تصرف میں ہے' ممالک کی خوشحالی کے درمیان بے حد فاصلے موجود ہیں۔ سب کے پاس ایک جیسی کاشتنی زمین' جنگلات' کوئلہ یا لوہا موجود نہیں۔ یہ بات بے حد اہم ہے کہ دنیا کے کچھ علاقوں انیسویں صدی میں قبضہ ہوا ہے جس میں سائبیریا' کینیڈا' اسٹریلیا وغیرہ ہیں' مگر ایشیا اور افریقہ کے وسائل کافی مدت سے استعمال میں آ رہے ہیں' یہ ممکن ہے کہ ان علاقوں کی زمینیں مستقبل قریب میں اس قابل نہ رہیں کہ وہ وہاں کے باسیوں کا پیٹ بھر سکیں' دوسری طرف ایسے علاقے بھی ہیں جہاں پندرہ سے بیس فیصد زمینوں پر کاشت نہ کرنے پر حکومتیں تلافی کے طور پر بڑی بڑی رقمیں ادا کرتی ہیں تاکہ دنیا بھر میں پیداوار کی قیمتوں کو مستحکم رکھا جا سکے۔ لہٰذا اقتصادی نظام کا موجودہ ڈھانچہ غیر فطری ہے اور زیادہ دیر تک قائم نہیں رکھا جا سکتا۔

شاید یہی تفاوت اور بے انصافی تھی جس نے امریکا کے سابق صدر لینڈن جانسن کو (Lyndon Johnson) کو یہ کہنے پر مجبور کیا۔

> "دنیا کے بہت سے فوری مسائل ایسے ہیں جو دنیا کے اندر موجود سرد جنگ کی وجہ سے پیدا نہیں ہوئے اور نہ ہی اس وجہ سے کہ بعض دشمنیاں بہت فعال ہیں' پیدا ہوئے ہیں' بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان نے دنیا کے اندر جو عظیم معاشرہ تشکیل دینے کی کوشش کی ہے اس کے راستے میں چند بہت بڑی رکاوٹیں حائل ہو گئی ہیں اور دنیا ایک ایسا مقام نہیں بن سکی جس میں بھوک اور بیماری سے گلو خلاصی حاصل کی جا چکی ہو' وہ لوگ جو ایسی اقوام کا حصہ ہیں جو ترقی کے راستے پر گامزن ہیں' وہ اپنے ہمسائیوں کے مسائل کو نظرانداز کر رہے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ اس کے باعث خود ان کی خوش حالی بھی متاثر ہو گی۔ ان مسائل کا کوئی سادہ حل موجود نہیں' ماضی میں تو اس کا کوئی حل

ممکن ہی نہیں تھا' مگر اب جب کہ دنیا میں سائنس نے اپنے آپ کو اس سطح تک پہنچا دیا ہے کہ انسان کو فطرت اور دنیاوی معاملات میں کامیابی حاصل کرنا ممکن نظر آنے لگا ہے۔"

لنڈن جانسن نے یہ حیران کن فیصلہ کیا تھا کہ اس نے ریاست ہائے متحدہ امریکا کے دفاعی بجٹ میں سے جو رقم بچائی تھی اس کو غریب ممالک کی خوشحالی کے لیے مختص کر دیا تھا۔ کاش ایسے اور لوگ بھی دنیا میں ہوں جو عالمی سطح پر اسلحے کی دوڑ کو ختم کرنے کی کوشش کریں فوجی اخراجات میں کٹوتی کریں اور عالمی ترقیاتی مسائل پر ان کو خرچ کریں۔

یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ شمال کے تمام دانشور استحصال کے اس عمل میں شریک ہیں' کبھی کبھی کوئی آواز اس استحصال کے خلاف بھی اٹھائی جاتی ہے مگر عام طور پر وہ صدا بصحرا ہی ثابت ہوتی ہے' اس بات کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے کہ شمال سے جنوب منتقلی کے عمل کا تسلسل جاری رہے' چنانچہ ایک ایسی ہیں میکانیت (Mechanism) کا تصور لائی نس پاؤلنگ (Linus Pauling) نے اس وقت پیش کیا تھا جب 1969ء کو نوبل سمپوزیم سٹاک ہوم کے مقام پر ان کو انعام دیا گیا تھا۔ پاؤلنگ نے کہا تھا کہ 200 بلین ڈالر کے وسائل ہر برس غریب ممالک کو منتقل کیے جائیں یہ گویا دنیا بھر کی آمدن پر آٹھ فیصد انکم ٹیکس تھا' جو اس کے خیال میں بین الاقوامی سطح پر ادا کرنا ضروری تھا۔ پھر اس نے خود ہی یہ سوال اٹھایا تھا کہ یہ سرمایہ آئے گا کہاں سے؟ اس کے جواب میں سب سے پہلے تو اس نے ملٹری ازم (Militarism) کی نشاندہی کی تھی جو اس وقت انسانیت کا سب سے بڑا روگ ہے' اس پر دنیا اس وقت 250 بلین ڈالر سالانہ خرچ کرتی تھی مگر 1983ء تک یہ خرچ تین گنا زیادہ ہو چکا تھا اور اب تو اور بھی کئی گنا بڑھ چکا ہو گا' پاؤلنگ چاہتا تھا کہ کسی طرح ان ممالک کی صحیح معنوں میں مدد ہو سکے اور وہاں سائنسی بنیادوں پر اقتصادیات کو مستحکم کیا جا سکے۔ جیسا کہ توقع تھی پاؤلنگ کے اس خیال کو دیوانے کا خواب قرار دیا گیا' مگر بعد میں یہی خیال 1980ء میں ولی برانٹ (Willy Brandt) کمیشن نے بھی پیش کر دیا' رپورٹ میں کہا گیا تھا۔

"یہ ہماری کون وک شن (Conviction) ہے اور اس کو سنجیدگی سے لینا ضروری

ہے کہ فنڈز کو منتقل کرنا شروع کیا جائے ـــــ اس کا کوئی خود کار طریقہ ہونا چاہیے' اور اس کے تعین کے ساتھ کسی طرح کی شرط بھی نہیں ہونی چاہیے کہ بعض حالات میں امیر اقوام اسے ادا نہ بھی کریں ـــــ جو کچھ داؤ پر لگا ہوا ہے وہ بین الاقوامی سطح کے بہت سے عوامل ہیں۔"

ولی برانٹ نے پھر سوال اٹھایا تھا۔

"اس بات کو غیر حقیقت پسندانہ کیوں سمجھا جائے اگر کسی ایسے ملک پر کوئی ٹیکس لگا دیا جائے جو اسے ادا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو' پھر اس کے علاوہ جو کچھ سمندر کی تہہ سے نکالا جائے اس پر ٹیکس لگایا جائے اور ان تمام وسائل پر جو یہ ممالک قدرت سے حاصل کرتے ہیں۔"

اس خیال ک ولی برانٹ نے انٹرنیشنل کامن (Common) یعنی بین الاقوامی مشترک کہا ہے مگر یہ اصل میں پاؤلنگ کے بین الاقوامی ٹیکس ہی کی مابعدیات ہے' وہی خیال جو 1969ء میں پیش کیا گیا تھا' کیونکہ سمندر اور سمندر کی تہہ کسی ایک قوم کی نہیں پوری انسانیت کی ملکیت ہے' اور یہ ایک نیا مگر بے حد امکانات رکھنے والا وسیلہ ہے جو انسان کے پورے مستقبل پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔

اب بیسویں صدی کی آخری دہائی میں شمال اور جنوب کے مابین پیدا ہونے والی خلیج کو پاٹنے کے سلسلے میں دونوں علاقوں میں شعور بڑھا ہے مگر سب سے بڑی بات اس سلسلے میں یہ ہے کہ ان فنڈز کو جنوب کے ممالک میں منتقل کرنا صرف اور صرف اسی صورت میں عملی طور پر ممکن ہو گا اگر جنوب کے ممالک اپنی مدد آپ کرنے کے لیے تیار ہوں۔ ورنہ انسان کا دکھ محسوس کرنے والے ان چند لوگوں کی یہ کوشش ضائع ہو جائے گی۔ لہٰذا یہ بھی دیکھ لینا چاہیے کہ اس سلسلے میں خود غریب ممالک کو کیا کرنا چاہیے۔

گنر مرڈال (Gunner Myrdal) کی ایک نوبل انعام یافتہ کتاب ہے 'ایشین ڈرامہ' Asian Drama جس کا ذیلی عنوان ہے 'An Enquiny into Poverty of Nations' (اس کا جزوی اردو ترجمہ نیشنل بینک آف پاکستان کی وساطت سے شائع ہو چکا ہے) ایڈم سمتھ (Adam Smith) نے ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام Wealth of Nation تھا اور وہ صنعتی انقلاب کے آغاز میں لکھی گئی تھی اور ان دو کتابوں میں دو

سو سال کا فرق تھا ــــــــ یہ ویسا ہی کام ہے جیسا کہ جے برونسکی (J. Bronowsky) نے ڈارون کی کتاب The Descent of Man کے مقابلے میں The Ascent of Man لکھ کر کیا تھا' ایڈم سمتھ نے ان امکانات کی نشاندہی کی تھی' جن سے معاشرے کی بنیادوں کو ہلایا جا سکتا تھا مگر مرڈال نے ایشیا کے غریب ممالک کے دکھ پر اظہار افسوس کیا تھا اور ان کو ''نرم ریاستیں'' (Soft States) کہا تھا خواہ وہ ریاستیں بھارت کی طرح جمہوریت کی راہ پر گامزن تھیں یا پاکستان کی طرح آمریت کا شکار تھیں' ان کو ''نرم'' اس لیے کہا جاتا تھا کہ وہ اپنی بنیادی صورت حال میں ایسی تبدیلی لانے کے لیے قوت ارادی کا مظاہرہ نہیں کر سکتی تھیں' جیسا کہ مغربی ممالک نے صدیوں کے جمود کی صورت حال سے نکلنے اور ایسے صنعتی دور میں داخل ہونے کے لیے کیا تھا جہاں ترقی کی رفتار تیز تر ہو جاتی ہے' چنانچہ یہ ان ارمان (Idealogies) اور حکمت عملی کو اختیار کرنے کے عمل کا فقدان تھا جو غربت کا خاتمہ کر سکتی تھی۔ اصل میں تیکنیکی مہارت اور سرمایہ تو ہتھیار ہیں جن کی مدد سے غربت کی رکاوٹوں کو توڑا جا سکتا ہے' مگر ان سے بھی زیادہ ایک اور شے کی پیشگی ضرورت ہے اور وہ ہے قومی سطح پر مصمم ارادہ ــــــــ پروفیسر رستوو (Prof : Rostow) کے الفاظ میں' کوئی بھی قوم اس وقت ایک بتدریج ترقی کی عملی پرواز میں داخل ہوتی ہے جب وہ نہ صرف معاشرتی طور پر بالائی سرمایہ (Over Head Capital) تخلیق کر لیتی ہے' ــــــــ یہ سرمایہ مواصلاتی نظام میں لگا ہوتا ہے یا سکولوں میں یا ٹیکنیکل اداروں میں' ــــــــ یہ اس انتظار میں ہوتا ہے کہ کب اسے زراعت اور صنعت کے میدانوں میں کھل کھیلنے کا موقعہ ملے' اس کے ساتھ اس امر کی بھی اشد ضرورت ہے کہ کوئی سیاسی قوت ایسی ہو' جو اقتصادیات کے جدید تر ہونے کے عمل کو سنجیدگی سے لے اور اسے اعلیٰ ترین سیاسی منصب قرار دے' یہی وہ رویہ تھا جو 1948ء کے جرمن انقلاب میں اختیار کیا گیا' یہی رویہ 1868ء میں جاپان نے میجی بادشاہت (Meji Restoration) میں اختیار کیا' اور پھر یہی کہانی روس اور چینی انقلاب میں دہرائی گئی' مگر 1947ء کے بعد جب ہم پاکستان تخلیق کرنے کا معجزہ قرار داد پاکستان کے سات برس کے اندر اندر انجام دے چکے تھے ہم میں کوئی ایسی سیاسی جماعت پیدا نہ ہوئی جو اقتصادی اور سائنسی ترقی کو ریاست کی مرکزی حکمت عملی قرار دیتی' جب ہم پاکستان کے ابتدائی دنوں کو یاد کرتے ہیں' اور ان

واقعات کو دہراتے ہیں تو کہیں سے بھی ہمیں یہ نعرہ سنائی نہیں دیتا کہ ہم ہر قیمت پر غربت کو دور کریں گے' راجیو کے زمانے میں غربت ہٹاؤ کا نعرہ کسی حد تک بھارت میں تو سنائی دیتا رہا ہے مگر اب تک اس کی گونج پاکستان میں نہیں ہے' آج بھی نرسیما راؤ کے حوالے سے اسی طرح کی صورت حال کو بیان کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے' مگر ہم نے ان مسائل کو فوقیت ہی نہیں دی ہے جو غربت کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں' سیاسی جماعتوں نے ایک دوسرے پر طرح طرح کے استحصال کے الزامات بھی لگائے ہیں مگر یہ فیصلہ کبھی نہیں کیا گیا کہ ہم غربت کو کسی قیمت پر قبول نہیں کریں گے۔

اقوام متحدہ کے اعداد و شمار کے مطابق 1987ء تک دنیا کی 25 فیصد آبادی جو 1.2 بلین نفوس پر مشتمل ہے ترقی یافتہ ہے' اور وہ دنیا کے 2/5 حصے پر آباد ہے اور دنیا کے 80 فیصد قدرتی وسائل پر قابض ہے' جبکہ دنیا کے 3.8 بلین آبادی کس مپرسی کے عالم میں ہے' وہ مستحقین پر مشتمل ہے اور دنیا کے بقایا 3/5 حصے پر آباد ہے۔

جو شے اس ترقی یافتہ گروہ کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔ "قوت عمل" ہے یہ ایک قوت ہے' ایک حیاتیاتی توانائی (Elan) ہے جو بنیادی طور پر ان کی قوت فیصلہ سے ابھرتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کا تعلق سائنس اور ٹیکنالوجی کے استعمال سے بھی ہے' بنیادی طور پر یہ اس گروہ کا سیاسی فیصلہ ہے' جو ترقی پذیر دنیا یعنی جنوب کے سیاہ و سفید کا مالک ہے' وہ چاہے تو اس بے نوائی کو توانائی بنا دے مگر اس کے لیے ضروری ہو گا کہ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی کو کام میں لائے۔

جنوب کے کچھ ممالک بے حسی کے اس عمل سے مستثنیٰ ہیں' مثلاً سنگا پور' جنوبی کوریا اور ملائیشیا' باقی تمام ممالک میں اس عزم کی کمی ہے جس کو ڈاکٹر عبدالسلام نے ارمان کا نام دیا ہے یعنی تیسری دنیا کے ممالک کا وہ عزم' جو غربت کا خاتمہ کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ اگرچہ ہندوستان میں کانگرس نے غربت دور کرنے کے لیے زبانی گفتگو تو بہت کی ہے مگر عملی طور پر کوئی مثبت قدم نہیں اٹھایا' حالانکہ آزادی حاصل کرنے کے 45 برس کے بعد وہاں خواندگی کی شرح 70 فیصد ہو چکی ہے۔ پاکستان کی صورت حال کو آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں یہاں شرح خواندگی شاید 45 برس پہلے کی شرح سے بھی نیچے جا چکی ہے' روٹی' کپڑا' مکان کے نعرے تو لگے ہیں مگر غربت دور کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش

سوائے پہلے پانچ سالہ منصوبہ کے اور کہیں نظر نہیں آتی۔ اس منصوبے پر بھی عملدر آمد نہیں ہو پایا' اس کے بعد تو دیوار ٹیڑھی ہی ہوتی چلی گئی ہے۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کو ترقی دینا گویا زمین پر جنت بنانے کی ایک خواہش ہے مگر ہم شاید بعض درویش صوفیا کی طرح اپنے حال میں مست ہو گئے ہیں' تیسری دنیا کے ممالک کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنے قدرتی وسائل کو ہمسایوں کے ساتھ سرد یا گرم جنگ میں ضائع کیا ہے۔ لہٰذا اب ان کے پاس وہ وسائل بچے ہی نہیں جن کو سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی پر صرف کیا جا سکے' پھر اس پر یہ اضافہ بھی ہے کہ یونیورسٹیوں کا نظام بے حد ناقص ہے' سائنس کے تحقیقی مراکز نہ ہونے کے برابر ہیں' اگر ہیں بھی تو ان کا آپس میں اور پھر قومی یونیورسٹیوں سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔ ایسی فضا پیدا کر دی گئی ہے کہ سائنس دانوں کے ملک کے اندر رہنا ناممکن ہو گیا ہے۔ وہ لوگ جو اپنے وطن کی تقدیر کو بدل سکتے تھے اب باہر کے ممالک میں اپنے خاندانوں کے لیے دولت کما رہے ہیں۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران خوش قسمتی سے ہم نے مستریوں اور کاریگروں کی ایک جماعت پیدا کر لی تھی' یہ اس وجہ سے ہوا تھا کہ دوسری جنگ عظیم کے دوران مغربی ممالک سے درآمدی بند ہو گئی تھی' پاکستان بننے کے بعد یہ لوگ بھی صنعتی دنیا کی ریڑھ کی ہڈی ثابت ہو سکتے تھے مگر ان کو بھی عرب ممالک میں دولت کمانے کے لیے بھیج دیا گیا اور جو کچھ زرمبادلہ کی شکل میں انہوں نے کمایا' اس سے کاریں اور سامان تعیش درآمد کیا گیا' جب یہ لوگ واپس آتے ہیں تو ان کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کی کوئی فضا ملک میں موجود نہیں ہوتی لہٰذا یہ عظیم وسیلہ جو اتفاق سے پیدا ہو گیا تھا ضائع کیا جا چکا ہے۔

ان حالات میں اگر کوئی محب وطن دانشور یا سائنس دان مایوسی کا شکار ہوتا ہے تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے' کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ قیامت کے دن سب سے پہلا سوال جو ہماری نسل سے کیا جائے گا یہ ہو گا کہ تم نے اپنے رب کے عظیم عطیے کو ضائع کیوں کر دیا؟ کیا ہم اس قدر بے حس ہیں کہ ہم کو آئندہ نسلوں کے بارے میں سوچنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی' ہم روز کنواں کھودتے ہیں' اس میں سے پانی پیتے اور شام ہونے سے پہلے پہلے اس کو پھر سے بند کر دیتے ہیں' کیا ہم اپنی ناک سے آگے نہیں دیکھ

سکتے۔ خدا کی رحمت سے امید ہے کہ وہ گناہ تو معاف کر دے گی' مگر مجھے معلوم نہیں کہ ناشکری معاف ہو سکتی ہے یا نہیں "تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔"

غربت کی ایک وجہ بڑھتی ہوئی آبادی بھی ہے' پاکستان کا شمار اب ایسے ممالک میں ہوتا ہے جہاں آبادی بے حد تیزی سے بڑھ رہی ہے' آبادی پر قابو پانے کی سنجیدہ کوشش ابھی تک نظر نہیں آتی' بعض مذہبی حلقے آبادی پر قابو پانے کی مخالفت میں بہت آگے نکل گئے ہیں' انہوں نے یہ فراموش کر دیا ہے کہ جب آبادی پر کنٹرول کا کوئی تصور موجود نہیں تھا تو اس زمانے میں بیماریاں' وبائیں' قدرتی آفات اور جنگیں آبادی کو بڑھنے سے روکتی تھیں' مگر اب جب کہ دنیا سائنس اور تیکنیکی اعتبار سے بہت آگے جا چکی ہے' اور انسان کی اوسط عمر میں غیر متوقع اضافہ ہو چکا ہے' آبادی پر قابو پانا ضروری ہو گیا ہے' اگر ہم ایک ہی روٹی پکانے کی استطاعت رکھتے ہوں تو کتنے نفوس کو اس میں حصے دار بنایا جا سکتا ہے' تیسری دنیا کا مسئلہ یہ بھی ہے کہ نہ تو وہ روٹیوں میں تعداد میں اضافہ کرتی ہے اور نہ ہی حصوں کی بڑھتی ہوئی تعداد میں کمی آنے دیتی ہے' لہٰذا اس صورت حال میں بھوک اور افلاس سے نجات پانا کیسے ممکن ہے' جنوبی ایشیا کے ممالک میں خاص طور پر یہ معاملہ سنگین ہوتا چلا جا رہا ہے' بھارت' پاکستان اور بنگلہ دیش میں آبادی جس طرح بڑھی ہے اس کی شاید کوئی مثال دنیا میں موجود نہ ہو' بھارت اور بنگلہ دیش پھر بھی جزوی طور پر آبادی کی شرح کو روکنے میں کامیاب ہوئے ہیں مگر ہم نے اب تک تو اس مسئلے کو محض نظر انداز ہی کیا ہے۔

جب آبادی میں اضافہ اس قدر زیادہ ہو جاتا ہے کہ چھپائے نہیں بنتی' تو پھر اس کو تسلیم تو کر لیا جاتا ہے مگر یہ نہیں بتایا جاتا کہ اس کے مضمرات کیا ہیں' ابھی تک مرڈال جیسے ماہرین اقتصادیات کی تنبیہہ پر پوری توجہ نہیں دی گئی' اگر یہ مسئلہ اسی طرح بڑھتا رہا تو پھر یہ خدشہ ہے کہ تھومس مالیتھوس (Thomas Malthus) کی عالمی آبادی کے بارے میں وہ پیشین گوئی پوری نہ ہو جائے جس میں ایک کشف (Apocalypse) کے ذریعے چار گھوڑ سواروں کا ذکر ہے یعنی جنگ' وبا (Pestilence) قحط اور قدرتی آفات' تیسری دنیا کے ممالک بھول بھلیوں میں گرفتار ہیں اور نجات کا راستہ کھو چکا ہے' جب تک تیسری دنیا کے ممالک اپنی آبادی پر قابو نہیں پاتے اور صرف یہی نہیں کہ وہ آبادی

کی موجودہ سطح کو قائم رکھیں بلکہ انہیں آبادی کم کرنی پڑے گی۔ کلب آف روم رپورٹ کے مطابق اس کال کوٹھڑی سے نکلنے کا اور کوئی رستہ نہیں ہے۔

یاد رہے کہ کلب آف روم رپورٹ نے انسانوں کو محض چند برس دیے ہیں جن کے دوران وہ حیاتیاتی کرے کو مکمل تباہی سے بچا سکتے ہیں' اس میں صنعتی ممالک کی غیر محتاط صنعت کاری بھی شامل ہے اگر ہم نے فوری اقدام نہ کیے' تو پھر واپسی کے تمام دروازے بند ہو جائیں گے۔ حیاتیاتی کرے میں جو خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں وہ دو طرح کی ہیں' ایک طرف تو آلودگی (Pollution) کے اثرات ہیں اور دوسری طرف ذرائع کی عسرت یا کمی ہے جو بتدریج واقع ہو رہی ہے' ان کی تلخیص کچھ یوں ہے۔

آلودگی کے اثرات

1- گرین ہاؤس اثرات جو کاربن ڈائی آکسائیڈ سے پیدا ہو رہے ہیں۔
2- اوزون (Ozon) میں جو شگاف پڑ گیا ہے اور وہ بڑھتا چلا جا رہا ہے۔
3- ریڈیائی فضلہ ——— جو ایٹمی تجربات سے پیدا ہوا ہے۔ اس میں بھی اضافہ ہی ہو رہا ہے۔
4- آبی آلودگی ——— جو صنعتی فضلے کے باعث پیدا ہوئی ہے یا تیل بے پرواہی سے سمندر میں پھینک دیا گیا ہے۔
5- ہوائی آلودگی ——— تیزابی' بارش' سلفر ڈائی آکسائیڈ اور دوسری صنعتیں گیسیں

ذرائع کی عسرت کے اثرات

1- گرم خطوں میں جنگلات کو جلانے کے لیے یا دوسرے استعمال کے لیے بیدردی سے کاٹا گیا ہے۔
2- زراعتی مقاصد کے لیے جھاڑیوں کو صاف کیا گیا ہے۔
3- کٹاؤ (Erosion) اور صحرا بننے کا عمل (Desertification) جاری ہے۔
4- ضرورت سے زیادہ مچھلیاں پکڑنا
5- توانائی کے ان ذرائع میں کمی کا پیدا ہونا' جن کی تجدید ممکن نہیں ہے' مثلاً تیل' کوئلہ اور گیس

6- ضرورت سے زیادہ شکار کرنے یا دولت حاصل کرنے کی ہوس میں جنگلی زندگی کا ضائع کیا جانا۔

اوپر دی گئی فہرست سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سارے مسائل زیادہ آبادی کی وجہ سے پیدا ہو رہے ہیں' موجودہ صنعتی دور سے پہلے دنیا کی آبادی کبھی ایک ارب سے زیادہ نہیں ہوئی مگر اب وہ 6 ارب تک پہنچنے ہی والی ہے' یہ بات کبھی فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ انسانی آبادی اصولی طور پر آلودگی پیدا کرتی ہے اور اس کی وجہ سے قدرتی وسائل میں کمی پیدا ہوتی ہے۔ اس بات کو یاد رکھنا چاہیے کہ مفلسی کا دوسرا نام کفر ہے' جارج برنارڈ شا (Geroge Bernad Shaw) نے کہا تھا "روحانی اقدار خالی پیٹ' بے چھت اور بے لباس لوگوں میں نہیں پنپ سکتیں"۔ جو مذہب بھی جائز جسمانی ضروریات کا خیال کیے بغیر روحانیت کی بات کرتا ہے وہ گمراہی پھیلاتا ہے' کارل مارکس نے ایسے ہی مذہب کو افیون کہا تھا اور نطشے نے اسے غلامانہ اخلاقیات قرار دیا تھا۔

مجھے افسوس ہے میں آپ کے سامنے تصویر کا روشن رخ پیش نہیں کر سکا' مگر یقین جانئے میں نے پوری کوشش کی ہے کہ تاریک رخ پر زیادہ زور نہ دوں' حالانکہ صورت حال خاصی مایوس کن ہے خصوصاً اس وجہ سے کہ ہم ابھی تک نہ مسائل کو پہچاننے کو تیار ہیں نہ ہی ہم کسی عزم کا مظاہرہ کر رہے ہیں —— ہم بہت وقت پہلے ہی ضائع کر چکے ہیں اور اب بہت کم وقت رہ گیا ہے —— کاش ہم خواب غفلت سے بیدار ہو سکیں۔

شہزاد احمد

11.8.1995

Unbalanced World

داستاں چاند ستاروں کی سنانے والو!
تم میرا کھوج لگاؤ تو کچھ بات بنے!
ترقی و مسرتوں سے چندھیائے لوگو!
جفا سے بھی بچو تو کچھ ثبات بنے!

